الحاد جدید کے مغربی اور مسلم دنیا پر اثرات

الحاد کا لفظ عموماً لادینیت اور خدا پر عدم یقین کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک توحید، نبوت و رسالت اور آخرت ، تینوں عقائد ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کا انکار یا اس سے اعراض باقی دو کو غیر موثر کردیتا ہے، اس لیے ان میں کسی ایک کا انکار بھی الحاد ہی کہلائے گا۔ چنانچہ اس تحریر میں ہم جس الحاد کی تاریخ پر گفتگو کریں گے ، وہ وجود خدا، نبوت و رسالت اور آخرت میں سے نظریاتی یا عملی طور پر کسی ایک یا تینوں کے انکار پر مبنی ہے۔ ہماری اس تحریر میں الحاد کی تعریف میں مروج 'Deisim'،'Atheism'اور 'Agnosticism' سب ہی شامل ہیں۔ ڈی ازم سے مراد آخرت کا انکار ہے، جبکہ ایتھزم اور ایگناسٹسزم خدا کے انکار سے متعلق ہیں۔

ازمنۂ قدیم سے ہی بعض لوگ الحاد کے کسی نہ کسی شکل میں قائل تھے، لیکن اس معاملے میں خدا کے وجود کا انکار بہت ہی کم کیا گیاہے ۔ بڑے مذاہب میں صرف بدھ مت ہی ایسا مذہب ہے جس میں کسی خدا کا تصور نہیں پایا جاتا۔ ہندو مذہب کے بعض فرقوں جیسے جین مت میں خدا کا تصور نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ دنیا بھر میں صرف چند فلسفی ہی ایسے گزرے ہیں جنھوں نے خدا کا انکار کیا۔ عوام الناس کی اکثریت ایک یا کئی خداؤں کے وجود کی بہرحال قائل رہی ہے۔ نبوت و رسالت کا اصولی حیثیت سے انکار کرنے والے بھی کم ہی رہے ہیں،ہاں ایسا ضرور ہوا کہ

جب کوئی نبی یا رسول ان کے پاس خدا کا پیغام لے کر آیا تو اپنے مفادات یا ضد و ہٹ دھرمی کی وجہ سے انھوں نے اس نبی یا رسول کا انکار کیا ہو۔ آخرت کا انکار کرنے والے ہر دور میں کافی بڑی تعداد میں دنیا میں موجود رہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے مشرکین کے بارے میں بھی یہی پتا چلتا ہے کہ وہ خدا کے منکر تو نہ تھے ،لیکن ان میں آخرت پر یقین نہ رکھنے والوں کی کمی نہ تھی۔

عالمی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خالص الحاد دنیا میں کبھی قوت نہ پکڑ سکا۔ دنیا بھر میں یا تو انبیاے کرام علیہم السلام کے ماننے والے غالب رہے یا پھر دین شرک کا غلبہ رہا۔ دین الحاد کو حقیقی فروغ موجودہ زمانے ہی میں حاصل ہوا ہے جب دنیا کی غالب اقوام نے اسے اپنے نظام حیات کے طور پر قبول کرلیا ہے اور اس کے اثرات پوری دنیا پر پڑ رہے ہیں۔ اس تحریر میں ہم یہ جائزہ لینے کی کوشش کریں گے کہ وہ کیا عوامل تھے جن کی بنیاد پر الحاد کو اس قدر فروغ حاصل ہوا؟ دنیا بھر میں الحاد کی تحریک نے کیا کیا فتوحات حاصل کیں اور اسے قبول کرنے والے ممالک اور اقوام کی سیاست، معیشت اور معاشرت پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟ تاریخ کے مختلف ادوار میں الحاد کی تحریک نے کیا کیا رنگ اختیار کیے اور دور جدید میں الحاد کی کون سی شکل دنیا میں غالب ہے؟ مغربی ممالک کے ساتھ ساتھ مسلم ممالک پر اس کے کیا اثرات مرتب ہو چکے ہیں اور اس کے مستقبل کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے؟

یورپ میں الحاد کی تحریک

یورپ میں قرون وسطیٰ ہی میں عیسائی حکومتیں قائم ہوچکی تھیں اور چرچ کا ادارہ پوری طرح مستحکم ہو چکا تھا۔ جب تیسری صدی عیسوی میں عوام الناس کی اکثریت نے عیسائیت قبول کرلی تو ان کے بادشاہ قسطنطین نے بھی عیسائیت قبول کرنے کا اعلان کردیا۔ اس کے بعد عیسائی علمااور ان کے قائد پوپ کو حکومتی معاملات میں غیر معمولی اثرو رسوخ حاصل ہوگیا۔ حکومتی طاقت کو استعمال کرکے انھوں نے معاشرے میں پھیلے ہوئے دین شرک اور بت پرستی کا خاتمہ کردیا اور اس کے ماننے والوں کو عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ جن لوگوں نے عیسائیت قبول کرنے سے انکار کیا، انھیں تہ تیغ کردیا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ پھر عیسائیت میں بھی حلول اور مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ماننے کا عقیدہ پیدا ہوگیا اور شخصیت پرستی اور اکابر پرستی نے جنم لیا جس نے ان کے دین میں شرک کو داخل کیا۔ عیسائی علما نے وقت کے مسلمہ نظریات ،جن میں ارسطو اور افلاطون کے سائنسی اور فلسفیانہ افکار بھی شامل تھے، کی مقبولیت کے پیش نظر انھیں اپنے دین میں داخل کر لیا۔ حکومتیں پوپ اور مذہبی علماکی رہنمائی میں چلنے لگیں جسے آج تھیو کریسی کہا جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ مذہبی رہنما اپنے مسلک اور عقیدے میں شدت اختیار کرتے گئے۔ صدیوں کے انحطاط (degeneration)) کے عمل سے ان میں بہت سے فرقے بھی پیدا ہوگئے اور ان میں اخلاقی انحطاط بھی در آیا۔ مذہبی انتہا پسندی اس حد تک پہنچ گئی کہ کوئی بھی شخص جو مرکزی چرچ کے معمولی سے حکم سے بھی اختلاف کرتا، اسے مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جاتا۔ نئے علوم و فنون کی تحصیل پر پابندی عائد کردی گئی ۔ اسی دور میں مسلمانوں نے یونانی فلسفے کی کتب کا عربی میں ترجمہ کیا اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں قابل قدر اضافے کیے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اہل یورپ میں بھی علم حاصل کرنے کا شعور پیدا ہوااور وہ یہی چیزیں سیکھنے کے لیے مسلم دنیا میں آئے۔ ایک ممتاز امریکی مصنف کے الفاظ میں:

"جیسے جیسے مسلمانوں کا اقتدار پھیلتا گیا، یہ لوگ اچھے سیکھنے والے اور اس پر عمل کرنے والے ثابت ہوئے۔مسلمان حکمرانوں نے مفتوحہ علاقوں کی ترقی یافتہ تہذیب کے مقابلے میں اپنی کمزوری (limitation)کو محسوس کرتے ہوئے مقامی اداروں، خیالات، نظریات اور ثقافت کو اسلامی سانچے میں ڈھال لیا ۔ انھوں نے اپنے سے زیادہ ترقی یافتہ مفتوحین سے سیکھنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کی۔عظیم لائبریریاں اور دار التراجم قائم ہوئے۔ سائنس، طب اور فلسفہ کی بڑی بڑی کتابوں کو مشرق و مغرب سے اکٹھا کرکے ان کے ترجمے کیے گئے۔یونانی، لاطینی، فارسی، شامی اور سنسکرت زبانوں سے ترجمہ کرنے کا کام عام طور پر یہودی اور عیسائی مفتوحین نے سر انجام دیا۔اس طرح ادب، سائنس اور طب کی دنیا بھر کی بہترین کتابیں عوام الناس کے لیے میسر ہوگئیں۔ترجمے کے دور کے بعد تخلیقی کام کا دور شروع ہوا۔تعلیم یافتہ مسلمان مفکرین اور سائنس دانوں نے حاصل شدہ علم میں قابل قدر علمی اضافے کیے۔یہ وہ دور تھا جس میں سائنس اور فلسفہ کے عظیم امام ابن سینا، ابن رشد اور الفارابی پیدا ہوئے۔بڑے بڑے شہروں قرطبہ، نیشاپور، قاہرہ، بغداد، دمشق اور بخارا میں بڑی بڑی لائبریریاں قائم ہوئیں، جبکہ یورپ اس دور میں دور تاریک سے گزر رہا تھا۔مسلمانوں اور غیر مسلموں کی سیاسی اور ثقافتی زندگیوں کو ان کے قبائلی اور مذہبی پس منظر کی رعایت سے اسلام کے فریم ورک میں لایا گیا۔نئے نظریات اور طور طریقوں کو اسلامائز کیا گیا۔اسلامی تہذیب ایک متحرک اور تبدیلی کے تخلیقی عمل کا نتیجہ تھی جس میں مسلمانوں نے دوسری تہذیبوں سے آزادانہ اچھی چیزوں کو لیا۔یہ خود اعتمادی اور کھلے پن کا مظہر تھا جو اس خیال سے پیدا ہوا کہ ہم آقا ہیں غلام نہیں ہیں، فاتح ہیں مفتوح نہیں ہیں۔بیسویں صدی کے مسلمانوں کے برعکس، وہ مسلمان تحفظ اور اعتماد کے احساسات سے بھرپور تھے۔ان کو مغرب سے کچھ لینے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ ہوتی تھی ،کیونکہ مغرب اس وقت ان پر سیاسی یا ثقافتی غلبہ نہ رکھتا تھا۔کلچر کا یہ بہاؤ اس وقت

الٹی سمت میں بہنے لگا، جب یورپ تاریک ادوار سے نکل کر مسلم مراکز میں اپنا کھویا ہوا ورثہ سیکھنے کے لیے آیا جس میں مسلمانوں کے ریاضی، طب اور سائنس کے اضافے بھی شامل تھے۔" (The Islamic Threat: Myth or Reality ، John L. Esposito، دوسرا ایڈیشن ، ۳۳۔ ۳۴)

تیرہویں سے سترہویں صدی تک یورپ میں چرچ کے اقتدار اور تنگ نظری کے خلاف بغاوت کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ اس دور میں یورپ میں رینی ساں Renaissance)) اور ریفارمیشن (Reformation) کی تحریکیں چلیں جن میں چرچ پر بھرپور تنقید کی گئی۔ اسی دوران میں مارٹن لوتھر کی مشہور پروٹسٹنٹ تحریک بھی چلی جس نے دنیاے عیسائیت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یورپ میں ایسے مفکرین بھی پیدا ہونے لگے جن کی تحقیقات نے ارسطو اور افلاطون کے ان سائنسی نظریات کو بھی چیلنج کر دیا جنھیں اہل کلیسا نے طویل عرصے سے مذہبی عقائد کا حصہ بنایا ہوا تھا۔ ان میں سب سے مشہور زمین کے کائنات کا مرکز ہونے اور اس کے ساکن ہونے اور سورج اور تمام اجرام فلکی کے زمین کے گرد گھومنے کا نظریہ تھا۔ ان مفکرین میں لیونارڈو ڈا ونسی (۱۵۱۹ء۔۱۴۵۲ء)، جیارڈینو برونو (۱۶۰۰ء ۔ ۱۵۴۸ء)، گلیلیو (۱۶۴۲ء ۔۱۵۶۴ء) اور جوہانس کپلر(۱۶۳۰ء ۔۱۵۷۱ء) زیادہ مشہور ہیں۔ مذہبی علما نے اس تنقید اور جدید نظریات کا سختی سے نوٹس لیا۔ انھوں نے عقل و منطق اور مشاہدے کی بنیاد پر حاصل ہونے والے سائنسی علم کو طاقت سے دبانا چاہا۔ احتساب (Inquisition) کی مشہور عدالتیں قائم ہوئیں جو اس قسم کے نظریات رکھنے والے مفکرین کو سخت سزائیں دیتیں۔ برونو کو کئی سال قید میں رکھنے کے بعد آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔ گلیلیو کو اپنے عقائد سے توبہ کرنا پڑی ورنہ اسے بھی موت کی سزا سنا دی گئی تھی:

"رینی ساں کا دور فکر انسانی میں ہر اعتبار سے ترقی کا دور ہے۔ اس دور میں آزادانہ سوچ اور الحاد کو فروغ حاصل ہوا۔ صرف اور صرف چرچ کے حکم کی بنیاد پر کسی چیز کو قبول کرنے کی پابندی کے بڑے مخالفین میں لیونارڈو ڈا ونسی تھے۔ انھوں نے علم کے حصول کے لیے تجربے کی اہمیت پر زور دیا۔ نکولو میکیا ولی بھی چرچ پر مسلسل تنقید کرتے رہے۔ ان کی شہرت بھی ایک ملحد کی ہے... جیارڈینو برونو کی موت(۱۶۰۰ء) آزادی فکر کے نئے دور کا آغاز ہے۔ برونو اٹلی کے رہنے والے ایک مصنف تھے جو علم کلام کے ماہر تھے۔ اپنی تحریروں کے باعث انھیں محکمۂ احتساب (Inquisition)کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے پورے یورپ کا سفر کیا جس کے دوران میں وہ اپنے نظریات کو تقریر و تحریر کے ذریعے سے پھیلاتے رہے۔ انھیں گرفتار ہو جانے کا خطرہ بھی لاحق رہا۔ چودہ سال کے بعد ، وینس شہر میں انھیں ان کے ایک پرانے شاگرد نے احتساب والوں کے ہاتھوں گرفتار کرا دیا۔ برونو احتساب کی عدالت کے سامنے اپنے نظریات سے انحراف نہ کر سکے جن میں مسیح (علیہ السلام)کی الوہیت سے انکار، اس دنیا کے ہمیشہ باقی رہنے کا عقیدہ اور روح کے حلول کا عقیدہ شامل ہے۔ وہ نظام شمسی کے کوپر نیکی نظریے (یعنی سورج نظام شمسی کا مرکز ہے) پر بھی یقین رکھتے تھے اور اس پر لیکچر بھی دیا کرتے تھے۔ برونو پر مقدمہ چلایا گیا اور عدالت کے سامنے ان کا جرم ثابت ہو گیا۔ برونو نے روم میں سات سال جیل میں گزارے۔ بالآخر فروری۱۶۰۰ میں انھیں آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔ اگلے دو سو سال میں ان کے علاوہ آزادی فکر کے اور بھی شہید موجود ہیں۔" (The History of Free Thought and Atheism، Dr. Gordon Stein ـ (http://www.positiveatheism.org (http://www.positiveatheism.org))

مذہبی علما اور سائنس دانوں میں یہ چپقلش چلتی رہی۔ وقت کے ساتھ ساتھ معاشرے پر اہل کلیسا کی گرفت کمزور ہوتی گئی اور فلسفیوں کا اثر و رسوخ بڑھتا چلا گیا۔ انیسویں صدی کے وسط تک ملحد فلسفیوں اور سائنس دانوں کی فکر اہل یورپ میں غالب فکر بن چکی تھی۔ چونکہ اہل کلیسا نے اپنے اقتدار کے دور میں سائنس دانوں کے ساتھ بہت ظالمانہ اور جابرانہ رویہ رکھا تھا، اس لیے مذہب اور سائنس میں ایک وسیع خلیج پیدا ہو چکی تھی۔ اہل سائنس نے مذہب کے بارے میں کوئی معقول رویہ اختیار کرنے کے بجائے اپنے سائنسی نظریات کی روشنی میں یہی مناسب سمجھا کہ اسے خیر باد ہی کہہ دیا جائے۔ اس معاملے میں اہل مذہب کا کردار بھی اتنا معیاری نہ تھا کہ اس کی پیروی کی جاتی۔ چنانچہ مشہور برطانوی ملحد فلسفی برٹرینڈ رسل لکھتے ہیں:

"میں تو یہاں تک سوچا کرتا ہوں کہ بعض اہم نیکیاں مذہب کے علم برداروں میں نہیں ملتیں۔ وہ ان لوگوں میں پائی جاتی ہیں جو مذہب کے باغی ہوتے ہیں۔ ان میں سے دو نیکیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور وہ راست بازی اور ذہنی دیانت ہیں۔ ذہنی دیانت سے میری مراد پیچیدہ مسائل کو ثبوت اور شہادتوں کی بنیاد پر حل کرنے کی عادت ہے۔ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ جب تک کافی ثبوت اور شہادتیں دستیاب نہ ہوں، تب تک ان مسائل کو غیر حل شدہ ہی رہنے دیا جائے... تحقیق کی حوصلہ شکنی ان میں سب سے پہلی خرابی ہے۔ لیکن دوسری خرابیاں بھی پیچھے نہیں رہتیں۔ قدامت پسندوں کو قوت و اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ تاریخی دستاویزات میں اگر کوئی بات عقیدوں کے بارے میں شبہات پیدا کرنے والی ہو تو ان کی تکذیب شروع کر دی جاتی ہے۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ جلد یا بدیر منحرف عقیدے رکھنے والوں کے خلاف مہم شروع کر

دی جاتی ہے۔ پھانسیاں گاڑ دی جاتی ہیں اور نظر بندی کے کیمپ بنا دیے جاتے ہیں۔ میں اس شخص کی قدر کرسکتا ہوں جو یہ کہے کہ مذہب سچا ہے، لہٰذا ہم کو اس پر ایمان رکھنا چاہیے(اور سچائی ثابت کرے) ،لیکن ان لوگوں کے لیے میرے دل میں گہری نفرت کے سوا کچھ نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مذہب کی سچائی کا مسئلہ اٹھانا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے اور یہ کہ ہم کو مذہب اس لیے قبول کرلینا چاہیے کہ وہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر سچائی کی توہین کرتا ہے ، اس کی اہمیت کو ختم کردیتا ہے اور جھوٹ کی بالادستی قائم کردیتا ہے۔... اشتراکیت کی برائیاں وہی ہیں جو ایمان کے زمانوں میں مسیحیت میں پائی جاتی تھیں۔ سوویت خفیہ پولیس کے کارنامے، رومن کیتھولک کلیسا کی قرون وسطیٰ کی عدالت، احتساب کے کارناموں سے صرف مقداری طور پر ہی مختلف تھے۔ جہاں تک ظلم و ستم کا تعلق ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس پولیس نے روسیوں کی ذہنی اور اخلاقی زندگی کو ایسا ہی نقصان پہنچایا جیسا کہ مذہبی احتساب کی عدالت نے مسیحی اقوام کی ذہنی اور اخلاقی زندگی کو پہنچایا تھا۔ اشتراکی تاریخ کی تکذیب کرتے ہیں۔ نشاۃ ثانیہ تک چرچ بھی یہی کام کیا کرتا تھا... جب دو سائنس دانوں کے درمیان اختلاف ہوتا ہے تو وہ اختلاف کو دور کرنے کے لیے ثبوت تلاش کرتے ہیں۔ جس کے حق میں ٹھوس اور واضح ثبوت مل جاتے ہیں، وہ راست قرار پاتا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ سائنس دان ہونے کی حیثیت سے ان دونوں میں سے کوئی بھی خود کو بے خطا خیال نہیں کرتا۔ دونوں سمجھتے ہیں کہ وہ غلطی پر ہوسکتے ہیں۔ اس کے برخلاف جب دو مذہبی علمامیں اختلاف پیدا ہوتا ہے تو وہ دونوں اپنے آپ کو مبرا عن الخطا خیال کرتے ہیں،وہ سمجھتے ہیں کہ ان سے کوئی غلطی نہیں ہوسکتی۔ دونوں میں سے ہر ایک کو یقین ہوتا ہے کہ صرف وہی راستی پر ہے۔ لہٰذا ان کے درمیان فیصلہ نہیں ہوپاتا۔ بس یہ ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگتے ہیں، کیونکہ دونوں کو یقین ہوتا ہے کہ دوسرا نہ صرف غلطی پر ہے ، بلکہ راہ حق سے ہٹ جانے کے باعث گناہ گار بھی ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور نظری مسائل حل کرنے کے لیے دنگافساد تک نوبت جاپہنچتی ہے۔" (لوگوں کو سوچنے دو، برٹرینڈ رسل، اردو ترجمہ قاضی جاوید ۸۱۔۸۶)

اسی دوران میں ڈی ازم (Deism)کی تحریک بھی پیدا ہوئی۔ اس کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ اگرچہ خدا ہی نے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے، لیکن اس کے بعد وہ اس سے بے نیاز ہوگیا ہے۔ اب یہ کائنات خود بخود ہی چل رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس تحریک کا ہدف رسالت اور آخرت کا انکار تھا۔ اس تحریک کو فروغ ڈیوڈ ہیوم اور مڈلٹن کے علاوہ مشہور ماہر معاشیات ایڈم سمتھ کی تحریروں سے بھی ملا۔ ان لوگوں نے بھی چرچ پر اپنی تنقید جاری رکھی اور چرچ کا جبر و تشدد جاری رہا۔ تقریباً دو سو سال تک یہ تحریک بھی موجود رہی۔ کلیسا کے انتہا درجے کے جبر وتشدد کا نتیجہ یہ نکلا کہ اٹھارہویں صدی میں یورپ کے اہل علم میں بالعموم انکار خدا کی لہر چل نکلی جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل تک اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ترکی کے مشہور عالم ہارون یحییٰ کے الفاظ میں:

"یقیناً الحاد یعنی وجود خدا سے انکار کا نظریہ پرانے وقتوں میں بھی موجود رہا ہے ،لیکن اٹھارہویں صدی میں کچھ مخالف مذہب مفکرین کے فلسفے کے پھیلاؤ اور سیاسی اثرات سے اس کا عروج شروع ہوا۔ مادیت پرستوں جیسے ڈائڈرٹ اور بیرن ڈی ہالبیک نے یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ کائنات مادے کا ایسا مجموعہ ہے جو ہمیشہ سے ایسے ہی موجود ہے اور اس کا کوئی نقطۂ آغاز نہیں۔ انیسویں صدی میں الحاد مزید پھیلا۔ بڑے بڑے ملحد مفکرین جیسے مارکس، انیجلز، نٹشے، ڈرخم اور فرائڈ نے سائنس اور فلسفے کی مختلف شاخوں کے علم کو الحادی بنیادوں پر منظم کیا۔(ان میں سے مارکس اور انیجلز ماہر معاشیات (Economists)، نٹشے ماہر فلسفہ (Philosopher)، ڈرخم ماہر عمرانیات (Sociologist) اور فرائڈ ماہر نفسیات (Psychologist) تھے۔) الحاد کو سب سے زیادہ مدد (ماہر حیاتیات Biologist) چارلس ڈارون سے ملی جس نے تخلیق کائنات کے نظریے کو رد کرکے اس کے برعکس ارتقا (Evolution) کا نظریہ پیش کیا۔ ڈارون نے اس سائنسی سوال کا جواب دے دیا تھا جس نے صدیوں سے ملحدین کو پریشان کر رکھا تھا۔ وہ سوال یہ تھا کہ "انسان اور جان دار اشیا کس طرح وجود میں آتی ہیں؟" اس نظریے کے نتیجے میں بہت سے لوگ اس بات کے قائل ہو گئے کہ فطرت میں ایسا آٹو میٹک نظام موجود ہے جس کے نتیجے میں بے جان مادہ حرکت پزیر ہو کر اربوں کی تعداد میں موجود جان دار اشیا کی صورت اختیار کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک ملحدین کائنات کے بارے میں ایک ایسا نقطۂ نظر (worldview) بنا چکے تھے جو ان کے نزدیک اس کائنات سے متعلق ہر ایک سوال کا جواب دیتا تھا۔ انھوں نے کائنات کی تخلیق کا انکار کرتے ہوئے کہا کہ یہ کائنات ہمیشہ سے ایسے ہی موجود ہے۔ انھو ں نے دعویٰ کیا کہ اس کائنات کا کوئی مقصد نہیں۔ اس میں جو توازن پایا جاتا ہے، وہ محض ایک اتفاقی امر ہے۔ انھیں یہ یقین ہوگیا کہ جان دار اشیا کے وجود پزیر ہونے کا سوال ڈارون نے حل کردیا ہے۔ ان کے خیال میں تاریخ اور عمرانیات سے متعلق ہر مسئلے کی تشریح مارکس اور ڈرخم نے کر دی ہے اور ملحدانہ بنیادوں پر فرائڈ نے ہر نفسیاتی سوال کا جواب دے دیا ہے۔ "

((The Fall of Atheism ، Harun Yahya ، http://www.yahyah.org (http://www.yahyah.org)

اسی الحاد کی بنیاد پر سیکولرازم کا نظریہ وجود پزیر ہوا جو مذہب اور الحاد کے درمیان ایک عملی تطبیق (Reconciliation)کی حیثیت رکھتا تھا۔ فلسفیانہ اور ملحدانہ نظریات نے اہل یورپ کی اشرافیہ کو بری طرح متاثر کر دیا تھا۔ ان کے ہاں تعلیم یافتہ ہونے کا مطلب ہی ملحد اور لادین ہونا تھا۔ دوسری طرف عوام الناس میں اہل مذہب کا اثر ورسوخ خاصی حد تک باقی تھا۔

اہل مذہب کا ایک اور مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ بہت سے فرقوں میں منقسم تھے اور ایک فرقے کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ دوسرے کی بالادستی قبول کرسکے۔ ان حالات میں انھوں نے یہ طے کر لیا کہ ہر فرد کو اپنی ذات میں تو اپنے عقیدے پر قائم رہنے کی آزادی دی جائے، لیکن اجتماعی اور ریاستی سطح پر مذہب سے بالکل لاتعلق ہو کر خالص عقل و دانش اور جمہوریت کی بنیادوں پر نظام حیات کو مرتب کر لیا جائے۔ اگر حکومت کا کوئی سرکاری مذہب ہو بھی تو اس کی حیثیت محض نمایشی ہو، اسے معاملات زندگی سے کوئی سروکار نہ ہو۔

سیکولر ازم کے اس نظریے کا فروغ دراصل مذہب کی بہت بڑی شکست اور الحاد کی بہت بڑی فتح تھی۔ اہل مغرب نے اپنے سیاسی، عمرانی اور معاشی نظاموں کو مذہب کی روشنی سے دور ہوکر خالصتاً ملحدانہ بنیادوں پر استوار کیا۔ مذہب کو چرچ تک محدود کر دیا گیا۔ تمام قوانین جمہوری بنیادوں پر بنائے جانے لگے۔ عیسائیت میں بھی فری سیکس گناہ کی حیثیت رکھتا ہے ،لیکن جمہوری اصولوں کے مطابق اکثریت کی خواہش پر اسے جائز قرار دیا گیا حتیٰ کہ ہم جنس پرستی کو بھی قانونی مقام دیا گیا اور ایک ہی جنس میں شادی کو بھی قانونی ٹھہرا لیا گیا۔ سود ہمیشہ سے آسمانی مذاہب میں ممنوع رہا ہے ،لیکن معیشت کا پورا نظام سود پر قائم کیا گیا۔ سیکولر ازم کے نتیجے میں الحاد اہل مغرب کے نظام حیات میں غالب قوت بن گیا ۔ان کی اکثریت اگرچہ اب بھی خدا کی منکر نہیں ہے ،لیکن عملی اعتبار سے وہ نبوت و رسالت اور آخرت کا انکار کر چکی ہے۔ اگر کوئی مذہب کو حق مانتا ہے تو پھر یہ لازم ہے کہ وہ اسے اپنی پرائیویٹ لائف کے ساتھ ساتھ پبلک لائف میں بھی اپنائے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو خدا کو ماننے کے باوجود وہ عملاً خدا ، نبوت اور آخرت کا انکار کرکے الحاد کو اختیار کرہی چکا ہے۔ اب اس کے بعد صرف انسانی اخلاقیات یا دین فطرت ہی باقی رہ جاتا ہے جسے ملحدین بھی مانتے ہیں۔ اہل مغرب اگرچہ ان میں سے بہت سے اصولوں کو چھوڑ چکے ہیں ،لیکن اب بھی وہ ان اخلاقی اصولوں کے بڑے حصے کو اپنائے ہوئے ہیں۔

مسلم معاشروں میں الحاد کا فروغ

پندرہویں اور سولہویں صدی میں اہل یورپ اپنے ممالک سے نکل کر مشرق و مغرب میں پھیلنا شروع ہوئے۔ انیسویں صدی کے آخر تک وہ دنیا کے بڑے حصے پر اپنی حکومت قائم کرچکے تھے۔ ان کی نوآبادیات میں مسلم ممالک کی اکثریت بھی شامل تھی۔ اہل یورپ نے ان ممالک پر صرف اپنا سیاسی اقتدار ہی قائم نہیں کیا ،بلکہ ان میں اپنے الحادی نظریات کو بھی فروغ دیا۔ مغربی ملحدین نے عیسائیت کی طرح اسلام کی اساسات پر بھی حملہ کیا۔ مسلم ممالک میں ان کے نظریات کے جواب میں چار طرح کے رد عمل سامنے آئے:

۱۔ مغربی الحاد کی پیروی

۲۔ مغرب کو مکمل طور پر رد کر دینا

۳۔مغرب کی پیروی میں اسلام میں تبدیلیاں کرنا

۴۔مغرب کے مثبت پہلو کو لے کر اسے اسلامی سانچے میں ڈھالنا

پہلا رد عمل مسلمانوں کی اشرافیہ (Elite) کا تھا۔ ان کی اکثریت نے اہل مغرب اور ان کے الحاد کو کلی یا جزوی طور پر قبول کرلیا۔اگرچہ اپنے نام اور بنیادی عقائد کی حد تک وہ مسلمان ہی تھے ،لیکن اپنی اجتماعی زندگی میں وہ الحاد اور لادینیت کا نمونہ تھے۔ بیسویں صدی کے وسط میں آزادی کے بعد بھی ان کی یہ روش برقرار رہی۔ ان میں سے بعض تو اسلام کی تعلیمات کے کھلم کھلا مخالف تھے جن میں ترکی کے مصطفیٰ کمال پاشا، ایران کے رضا شاہ پہلوی، تیونس کے حبیب بورغبیہ اور پاکستان کے جنرل یحییٰ خان شامل ہیں۔ مسلم حکمرانوں کی اکثریت نے اگرچہ اسلام کا کھلم کھلا انکار نہیں کیا، لیکن وہ عملی طور پر الحاد ہی سے وابستہ رہے۔ چونکہ مسلم عوام کی اکثریت کا سیاسی و معاشی مفاد انھی کی پیروی میں تھا، اس لیے عوام الناس میں الحاد پھیلتا چلا گیا۔ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔

دوسرا رد عمل روایتی مسلم علماکا تھا۔ انھوں نے اہل مغرب کے نظریات کو یک سر مسترد کردیا۔ انھوں نے مغربی زبانوں کی تعلیم، مغربی علوم کے حصول، مغربی لباس کے پہننے اور اہل مغرب کے ساتھ کسی بھی قسم کے تعلق کو حرام قرار دیا۔انھوں نے اپنے مدارس کے ماحول کو قرون وسطیٰ کے ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ انھوں نے دور جدید میں کسی مسئلے پر اجتہادی انداز میں سوچنے کے بجائے قدیم ائمہ کی حرف بہ حرف تقلید پر زور دیا۔ برصغیر میں اس نقطۂ نظر کو ماننے والے بڑے بڑے علما میں قاسم نانوتوی، محمود الحسن اور احمد رضا خان بریلوی شامل تھے ،جن کے نقطۂ نظر کو پورے ہندوستان کے دینی مدارس نے قبول کیا۔ اگرچہ ان علما میں کچھ مسلکی اور فقہی اختلافات موجود تھے، لیکن مغرب کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر بالکل یکساں تھا۔ اگرچہ ان میں سے بعض مغربی زبانیں سیکھنے اور مغربی علوم کے حصول کے مخالف نہ تھے ،لیکن عملاً ان کا رویہ اس سے دوری ہی کا رہا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے میں ان کا اثر و نفوذ کم سے کم تر ہوتا چلا گیا اور ان کے نقطۂ نظر کو ماضی کی چیز سمجھ لیا گیا۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ ان سے بے زار ہونے لگا اور آہستہ آہستہ یا تو پہلے نقطۂ نظر کو قبول کرکے الحاد کی طرف چلا گیا یا پھر اس نے تیسرے اور چوتھے نقطۂ نظر کو قبول کیا۔ معاشرے میں ان کا کردار یہی رہ گیا کہ وہ مسجد میں نماز پڑھا دیں، کسی کے گھر میں ختم قرآن کردیں یا پھر نکاح، بچے کی پیدایش اور جنازے کے وقت چند رسومات ادا کردیں۔ عملی زندگی میں ان کے کردار کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جمعہ کی نماز کے وقت لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے یہ انتظار کر رہے ہوتے ہیں کہ کب مولوی صاحب وعظ ختم کریں اور وہ مسجد میں جا کر نماز جمعہ ادا کریں۔ جیسے ہی وعظ ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے ، لوگ جوق در جوق مسجد کی طرف آنے لگتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو ان کے وعظ اور تقاریر سے کوئی دلچسپی نہیں۔ انھی روایتی علما میں سے بعض نے جدید دنیا کے علوم سے واقفیت حاصل کرکے عصر حاضر کے زندہ مسائل کو اپنا ہدف بنایا ہے۔ عام روایتی علما کی نسبت ان کا اثر و نفوذ معاشرے میں بہت زیادہ ہے اور ان کی دعوت کو سننے والے افراد کی کوئی کمی نہیں۔

اس دور میں امت مسلمہ کی علمی و فکری قیادت برصغیر اور مصر کے اہل علم کے ہاتھ میں آچکی تھی۔ بعض مسلمان مفکرین نے اسلام اور جدید الحادی نظریات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے اسلام کے بعض بنیادی عقائد و اعمال کا بھی انکار کردیا۔ اس نقطۂ نظر کو ماننے اور پھیلانے والوں میں ہندوستان کے سرسید احمد خان ، اورمصر کے محمد عبدہ ، طٰہٰ حسین اور سعد زغلول شامل ہیں۔ اسی فکر کو بیسویں صدی میں غلام احمد پرویز اور ان کے شاگرد ڈاکٹر عبد الودود نے پیش کیا۔ روایتی اور چوتھے نقطۂ نظر کے حامل علما کے اثر و رسوخ کے پیش نظر اس فکر کو مسلم معاشروں میں عام مقبولیت حاصل نہ ہو سکی تاہم اس سے اشرافیہ کا ایک اہم حلقہ ضرور متاثر ہوا۔

چوتھا رد عمل ان اہل علم کا تھا جو روایتی علما کے قدیم علمی ورثے کے ساتھ ساتھ جدید علوم سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے مغرب کے الحادی افکار پر کڑی نکتہ چینی کی اور تیسرے نقطۂ نظر کے حامل علماکے برعکس اسلام کو معذرت خواہانہ انداز کے بجائے باوقار طریقے سے پیش کیا۔ انھوں نے روایتی علما پر تنقید کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت تو ناقابل تغیر ہے، لیکن قرون وسطیٰ کے علمانے اپنے ادوار کے تقاضوں کے مطابق جو قانون سازی کی تھی، اس کی تشکیل نو (Reconstruction)کی ضرورت ہے۔ روایتی علماکے برعکس انھوں نے جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے حصول پر زور دیا۔ اس نقطۂ نظر کے حاملین میں ہندوستان کے اہل علم میں سے محمد اقبال، ابوالکلام آزاد ، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، حمید الدین فراہی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مصر کے علما میں رشید رضا، حسن البنا اور سید قطب شامل ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے ممالک کے جدید اہل علم نے انھی کی پیروی کی۔ اسی نقطۂ نظر کے حاملین نے عالم اسلام میں بڑی بڑی تحریکیں برپا کیں جنھوں نے جدید طبقے کو اسلام سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ روایتی علما کی نسبت انھیں تعلیم یافتہ طبقے میں کافی زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کے اثرات اپنے اپنے معاشروں پر نہایت گہرے ہیں۔

مغربی اور مسلم معاشروں پر الحاد کے اثرات

الحاد کے اس عروج نے مغربی اورمسلم معاشروں پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہو گا کہ انھوں نے قدیم ورثے کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا اور عیسائیت اور اسلام کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج پیدا کر دیا۔ ہم الحاد کے اثرات کو نظریات، فلسفے، سیاست، معیشت ، معاشرت اور اخلاق، ہر پہلو میں نمایاں طور پر محسوس کر سکتے ہیں:

عقائد، فلسفہ اور نظریات

سب سے پہلے ہم نظریاتی اور فلسفیانہ پہلو کو لیتے ہیں۔ الحاد نے عیسائیت اور اسلام کے بنیادی عقائد یعنی وجود باری تعالیٰ، رسالت اور آخرت پر حملہ کیا اور اس کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلائے۔ خدا کے وجود سے انکار کر دیا گیا، رسولوں کے تاریخی وجود ہی کاانکار کر دیا گیا اور آخرت سے متعلق طرح طرح کے سوالات اٹھائے گئے۔ اس ضمن میں ملحدین کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی، کیونکہ یہ تینوں عقائد مابعد الطبیعیاتی حقائق سے تعلق رکھتے ہیں جسے اس دنیا کے مشاہداتی اور تجرباتی علم کی روشنی میں نہ تو ثابت کیاجاسکتا ہے اور نہ رد کیا جاسکتا ہے۔ ان ملحدین نے عیسائیت پر ایک اور طرف سے بڑا حملہ کیا اور وہ یہ تھا کہ قرون وسطیٰ کے عیسائی علمانے اپنے وقت کے کچھ سائنسی اور فلسفیانہ نظریات کو اپنے نظام عقائد (Theology)کا حصہ بنا لیا تھا جیسے زمین کائنات کا مرکز ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے۔ جب جدید سائنسی تحقیقات سے یہ نظریات غلط ثابت ہوئے تو بہت سے لوگوں کا پوری عیسائیت پر سے اعتماد اٹھ گیا اورانھوں نے فکری طور پر بھی الحاد کو اختیار کر لیا۔ اسلام میں چونکہ اس قسم کے کوئی عقائد نہیں، لہٰذا اسلام اس قسم کے حملوں سے محفوظ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ الحاد کو مغرب میں تو بہت سے ایسے پیروکار مل گئے جو ہر قسم کے مذہب سے بے زاری کا اعلان کر کے خود کو فخریہ طور پر ملحد (Atheist)کہتے ہیں ،لیکن مسلمانوں میں انھیں ایسے پیروکار بہت کم مل سکے۔ مسلمانوں میں صرف ایسے چند لوگ ہی پیدا ہوئے جو عام طور پر کمیونسٹ پارٹیوں میں شامل ہوئے۔ اگر ہم کمیونسٹ تحریک سے وابستہ نسلی مسلمانوں کا جائزہ لیں تو ان میں سے بھی بہت کم ایسے ملیں گے جو خود کو کھلم کھلا دہریہ یا ملحد کہلوانے پر تیار ہوں۔

عیسائیت پر ملحدین کا ایک اور بڑا حملہ یہ تھا کہ انھوں نے انبیاے کرام، بالخصوص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وجود سے انکار کر دیا۔ انھو ں نے آسمانی صحیفوں بالخصوص بائیبل کو قصے کہانیوں کی کتاب قرار دیا۔ اس الزام کا کامیاب دفاع کرتے ہوئے کچھ عیسائی ماہرین آثار قدیمہ نے اپنی زندگیاں وقف کر کے علمی طور پر یہ بات ثابت کر دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک تاریخی شخصیت ہیں اور بائیبل محض قصے کہانیوں کی کتاب ہی نہیں ،بلکہ اس میں بیان کیے گئے واقعات تاریخی طور پر مسلم ہیں اور ان کا ثبوت آثار قدیمہ کے علم سے بھی ملتا ہے۔ یہ الحاد کے مقابلے میں عیسائیت کی بہت بڑی فتح تھی۔ اسلام کے معاملے میں ملحدین ایسا نہ کر سکے کیونکہ قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی حیثیت کو چیلنج کرنا ان کے لیے علمی طور پر ممکن نہ تھا۔ انھو ں نے اسلام پر حملہ کرنے کی دوسری راہ نکالی۔ ان میں سے بعض کوتاہ قامت اور علمی بددیانتی کے شکار افراد نے چند من گھڑت روایات کا سہارا لے کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی کردار پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی ،لیکن وہ اس میں بری طرح ناکام ہوئے، کیونکہ ان من گھڑت روایات کی علمی و تاریخی حیثیت کو مسلم علمانے احسن انداز میں واضح کر دیا جسے انصاف پسند ملحد محققین نے بھی تسلیم کیا۔ ان محققین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی عظمت کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ خدا کی ذات کے متعلق جو شکوک و شبہات ان ملحدین نے پھیلائے تھے، اس کی بنیاد چند سائنسی نظریات پر تھی۔ بیسویں صدی کی سائنسی تحقیقات جو خود ان ملحدین کے ہاتھوں ہوئیں،نے یہ بات واضح کر دی کہ جن سائنسی نظریات پر انھوں نے اپنی عمارت تعمیر کی تھی، بالکل غلط ہیں۔ اس طرح ان کی وہ پوری عمارت اپنی بنیاد ہی سے منہدم ہوگئی جو انھوں نے تعمیر کی تھی۔ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کر رہے ہیں۔

سیاست

فکری اور نظریاتی میدان میں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ الحاد اسلام کے مقابلے میں ناکام رہا ،مگر عیسائیت کے مقابلے میں اسے جزوی فتح حاصل ہوئی، البتہ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی میدانوں میں الحاد کو مغربی اور مسلم دنیا میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی ۔ سیاسی میدان میں الحاد کی سب سے بڑی کامیابی سیکولر ازم کا فروغ ہے۔ پوری مغربی دنیا اور مسلم دنیا کے بڑے حصے نے سیکولر ازم کو اختیار کر لیا۔ سیکولر ازم کا مطلب ہی یہ ہے کہ مذہب کو گرجے یا مسجد تک محدود کر دیا جائے اور کاروبار زندگی کو خالصتاً انسانی عقل کی بنیاد پر چلایا جائے جس میں مذہبی تعلیمات کا کوئی حصہ نہ ہو۔ مغربی دنیا نے تو سیکولر ازم کو پوری طرح قبول کر لیا اور اب اس کی حیثیت ان کے ہاں ایک مسلمہ نظریے کی ہے۔ انھوں نے اپنے مذہب کو گرجے کے اندر محدود کر کے کاروبار حیات کو مکمل طور پر سیکولر کر لیا ہے۔ چونکہ اہل مغرب کے زیر اثر مسلمانوں کی اشرافیہ بھی الحاد کے اثرات کو قبول کر چکی تھی، اس لیے ان میں سے بھی بہت سے ممالک نے سیکولر ازم کو بطور نظام حکومت کے قبول کر لیا۔ بعض ممالک جیسے ترکی اور تیونس نے تو اسلام سے کھلم کھلا بغاوت کا اعلان کیا، لیکن مسلم ممالک کی اکثریت نے سیکولر ازم اور اسلام کا ایک ملغوبہ تیار کرنے کی کوشش کی جس میں بالعموم غالب عنصر سیکولر ازم کا تھا۔

الحاد کو فروغ جمہوریت کے نظریے سے بھی ہوا۔ اگرچہ جمہوریت عملی اعتبار سے اسلام کے مخالف نہیں، کیونکہ اسلام میں بھی آزادی رائے اور شوریٰ کی بڑی اہمیت ہے، لیکن جمہوریت جن نظریاتی بنیادوں پر قائم ہے، وہ خالصتاً ملحدانہ ہے۔ جمہوریت کی بنیاد حاکمیت جمہور کے نظریے پر قائم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر عوام کی اکثریت خدا کی مرضی کے خلاف فیصلہ دے دے تو ملک کا قانون بنا کر اس فیصلے کو نافذ کر دیا

جائے۔ اس کی واضح مثال ہمیں اہل مغرب کے ہاں ملتی ہے، جہاں اپنے دین کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہوئے انھوں نے فری سیکس، ہم جنس پرستی، شراب اور سود کو حلال کر لیا ہے۔ مسلمانوں کے ہاں اس کی مثال شاید ترکی ہی میں مل سکتی ہے۔ اسلام نظریاتی طور پر جمہوریت کے مغربی تصور کا شدید مخالف ہے۔ اسلام کے مطابق حاکمیت اعلیٰ جمہور کا حق نہیں ،بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اسلام کی نظر میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرنا شرک ہے۔ سب سے بڑا اقتدار (Sovereignty) صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اس کے برعکس جہاں اللہ تعالیٰ نے کوئی ہدایت نہیں دی، وہاں عوام کی اکثریتی رائے اور مشورے سے فیصلہ کیا جانا چاہیے ۔ اکثریت کی مرضی کے خلاف اس پر اقلیتی رائے کو مسلط کرنا اسلام میں درست نہیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ ہر معاملہ مشورے سے طے کریں۔

معیشت

معیشت کے باب میں الحاد نے دنیا کو دو نظام دیے۔ ان میں سے ایک ایڈم سمتھ کا سرمایہ دارانہ نظام یا کیپیٹل ازم اور دوسرا کارل مارکس کی اشتراکیت یا کمیونزم۔ کیپیٹل ازم دراصل جاگیر دارانہ نظام (Feudalism) ہی کی ایک نئی شکل ہے جو نسبتاً جاگیر دارانہ نظام سے کچھ بہتر ہے۔ کیپیٹل ازم میں مارکیٹ کو مکمل طور پر آزاد چھوڑا جاتا ہے جس میں ہر شخص کو یہ آزادی ہوتی ہے کہ وہ دولت کے جتنے چاہے انبار لگا لے۔ جس شخص کو دولت کمانے کے لامحدود مواقع میسر ہوں، وہ امیر سے امیر تر ہوتا جائے گا اور جسے یہ مواقع میسر نہ ہوں، وہ غریب سے غریب تر ہوتا چلا جائے گا۔ حکومت اس سلسلے میں کوئی مداخلت نہیں کرتی۔ جاگیر دارانہ نظام کی طرح اس نظام میں بھی سرمایہ دار، غریب کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اس کا استحصال کرتا ہے۔ غریب اور امیر کی خلیج اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ ایک طرف گھی کے چراغ جلائے جاتے ہیں اور دوسری طرف کھانے کو دال بھی میسر نہیں ہوتی۔ ایک طرف ایک شخص ایک وقت کے کھانے پر ہزاروں روپے خرچ کر دیتا ہے اور دوسری طرف ایک شخص کو بھوکا سونا پڑتا ہے۔ ایک طرف علاج کے لیے امریکہ یا یورپ جانا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا اور دوسری طرف ڈسپرین خریدنے کی رقم بھی نہیں ہوتی۔ ایک طرف بچوں کو تعلیم کے لیے ترقی یافتہ ممالک کی یونیورسٹیوں کے دروازے کھلے ہوتے ہیں اور دوسری طرف بچوں کو سرکاری سکول میں تعلیم دلانے کے لیے بھی ماں باپ کو فاقے کرنا پڑتے ہیں۔ ایک طرف محض ایک لباس سلوانے پر لاکھوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں اور دوسری طرف استعمال شدہ کپڑے خریدنے کے لیے بھی پیٹ کاٹنا پڑتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے اس تفاوت کی مکمل ذمہ داری الحاد پر ہی نہیں ڈالی جاسکتی ،کیونکہ اس کا پیش رو نظام فیوڈل ازم ، جو کہ اس سے بھی زیادہ استحصالی نظام ہے، اس دور میں ارتقاپزیر ہوا جب مغربی دنیا میں عیسائی علمااور مسلم دنیا میں مسلم علماطبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ عیسائی تھیوکریسی اور مسلم علمانے جاگیر دارانہ نظام کے ظلم وستم اور استحصال کے خلاف کبھی موثر جدوجہد نہیں کی ،بلکہ اپنے ادیان کی تعلیمات کے برعکس وہ اس کے سرپرست بنے رہے۔ اٹھارہویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد فیوڈل ازم کی کوکھ سے کیپیٹل ازم نے جنم لیا، جو کہ امیر کے ہاتھوں غریب کے استحصال کا ایک نیا نظام تھا، لیکن اس کا استحصالی پہلو فیوڈل ازم کی نسبت کم تھا، کیونکہ وہاں تو بہتر مستقبل کی تلاش میں غریب کسی اور جگہ جا بھی نہیں سکتا۔چونکہ اہل مغرب اور اہل اسلام اپنے دین کی تعلیمات سے خاصے دور ہو چکے تھے، اس لیے یہ نظام اپنے پورے استحصالی رنگ میں پنپتا رہا۔ یورپ میں کارل مارکس نے کیپیٹل ازم کے استحصال کے خلاف ایک عظیم تحریک شروع کی جس میں اس نظام کی معاشی ناہمواریوں پر زبردست تنقید کی گئی۔ مارکس اور ان کے ساتھی فریڈرک اینجلز، جو بہت بڑے ملحد فلسفی تھے، نے پوری تاریخ کی ایک نئی تشریح (Interpretation) کی جس میں انھوں نے معاش ہی کو انسانی زندگی اور انسانی تاریخ کا محور و مرکز قرار دیا۔ ان کے نزدیک تاریخ کی تمام جنگیں، تمام مذاہب اور تمام سیاسی نظام معاشیات ہی کی پیداوار تھے ۔ انھوں نے خدا، نبوت اور آخرت کے عقائد کا انکار کرتے ہوئے دنیا کو ایک نیا نظام پیش کیاجسے تاریخ میں کمیونزم کے نام سے یاد رکھا جائے گا۔ کمیونزم کا نظام خالصتاً الحادی نظام تھا۔

کمیونسٹ نظام انفرادی ملکیت کی مکمل نفی کرتا ہے اور تمام ذرائع پیداوار، جن میں زراعت، صنعت، کان کنی اور تجارت شامل ہے ،کو مکمل طور پر حکومت کے کنٹرول میں دے دیتا ہے۔ پوری قوم ہر معاملے میں حکومت کے فیصلوں پر عمل کرتی ہے جو کہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ کمیونسٹ جدوجہد پوری دنیا میں پھیل گئی۔ اسے سب سے پہلے کامیابی روس میں ہوئی جہاں لینن کی قیادت میں ۱۹۱۷ء میں کمیونسٹ انقلاب برپا ہوا اور دنیا کی پہلی کمیونسٹ حکومت قائم ہوئی ۔ دوسرا بڑا ملک جس نے کمیونزم کو قبول کیا ، چین تھا ۔ باقی ممالک نے کمیونزم کی تبدیل شدہ صورتوں کو اختیار کیا۔ کمیونزم کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ اس میں فرد کے لیے کوئی محرک(Incentive) نہیں ہوتا جس سے وہ اپنے ادارے کے لیے اپنی خدمات کو اعلیٰ ترین انداز میں پیش کرسکے اور اس کے لیے زیادہ سے زیادہ محنت کرسکے۔ اس کے برعکس کیپیٹل ازم میں ہر شخص اپنے کاروبار کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے اور اس سے زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لیے دن رات محنت کرتا ہے اور

اپنی اعلیٰ ترین صلاحیتیں استعمال کرتا ہے۔ کیمونزم کی دوسری بڑی خامی یہ تھی کہ پورے نظام کو جبر کی بنیادوں پر قائم کیا گیا اور شخصی آزادی بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سوویت یونین کی معیشت کمزور ہوتی گئی اور بالآخر۹۱-۱۹۹۰ء میں یہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی۔ اس کے بعد اسے کیپیٹل ازم ہی کو اپنانا پڑا۔ دوسری طرف چین کی معیشت کا حال بھی پتلا تھا۔ چین نے اپنی معیشت کو بہتر بنانے کے لیے کیمونزم کو خیر باد کہہ دیا اور تدریجاً اپنی مارکیٹ کو اوپن کر کے کیپیٹل ازم کو قبول کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کیپیٹل ازم اور کیمونزم، دونوں نظام ہائے معیشت ہی استحصال پر مبنی نظام ہیں۔ ایک میں امیر غریب کا استحصال کرتا ہے اور دوسرے میں حکومت اپنے عوام کا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اہل مغرب نے اعلیٰ ترین اخلاقی اصولوں کو اپنا کر کیپیٹل ازم کے استحصالی نقصانات کو کافی حد تک کم کر لیا ہے، لیکن تیسری دنیا جس کی اخلاقی حالت بہت کمزور ہے، وہاں اس کے نقصانات کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ چونکہ یہاں ہم الحاد کی تاریخ کا مطالعہ کر رہے ہیں، اس لیے یہ کہنا مناسب ہو گا کہ پچھلی تین صدیوں میں معیشت کے میدان میں الحاد کو دنیا بھر میں واضح برتری حاصل رہی ہے اور دنیا نے الحاد پر قائم دو نظام ہائے معیشت یعنی کیپیٹل ازم اور کیمونزم کا تجربہ کیا ہے۔ کیمونزم تو اپنی عمر پوری کر کے تاریخ کا حصہ بن چکا ہے، اس لیے اس پر ہم زیادہ بحث نہیں کرتے ،لیکن کیپیٹل ازم کے چند اور پہلوؤں کا ایک مختصر جائزہ لینا ضروری ہے جو انسانیت کے لیے ایک خطرہ ہیں۔

کیپیٹل ازم کے نظام کی بنیاد سود پر ہے۔ بڑی بڑی صنعتوں کے قیام اور بڑے بڑے پراجیکٹس کی تکمیل کے لیے وسیع پیمانے پر فنڈز کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک سرمایہ دار کے لیے اتنی بڑی رقم کا حصول بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر اس کے پاس اتنی رقم موجود بھی ہو تو اسے ایک ہی کاروبار میں لگانے سے کاروباری خطرہ یا رسک بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ ایک کاروبار اگر ناکام ہوجائے تو پوری کی پوری رقم ڈوبنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اگر وہی رقم تھوڑی تھوڑی کر کے مختلف منصوبوں میں لگائی جائے تو ایک منصوبے کی ناکامی سے پوری رقم ڈوبنے کا خطرہ نہیں ہوتا اور تمام کے تمام منصوبوں کے ڈوبنے کا خطرہ بھی نہیں ہوتا۔ اسے علم مالیات (Finance)کی اصطلاح میں Diversification کہا جاتاہے۔ان بڑے بڑے پراجیکٹس کے لیے رقم کی فراہمی کے لیے دنیا نے Financial Intermediaries کا نظام وضع کیا ہے۔ اس درمیانی واسطے کا سب سے بڑا حصہ بینکوں پر مشتمل ہے۔ یہ بینک عوام الناس کی چھوٹی چھوٹی بچت کی رقوم کو اکٹھا کرنے کا کام کرتے ہیں جس پر بینک انھیں سود ادا کرتا ہے۔ پورے ملک کے لوگوں کی تھوڑی تھوڑی بچتوں کو ملا کر بہت بڑی تعداد میں فنڈ اکٹھا کر لیا جاتا ہے جو انھی سرمایہ داروں کو کچھ زیادہ شرح سود پر دیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر بینک عوام کو 8٪ سود کی ادائیگی کر رہا ہے تو سرمایہ دار سے 10٪ سود وصول کررہا ہو گا۔ اس 2٪ میں بینک اپنے انتظامی اخراجات پورے کر کے بہت بڑا منافع بھی کما رہا ہوتا ہے۔ سرمایہ دار عموماً اپنے سرمایے کو ایسے کاروبار میں لگاتے ہیں جو اس سرمایے پر بہت زیادہ منافع دے سکے۔ اگر ہم دنیا بھر کی مختلف کمپنیوں کے سالانہ اکاؤنٹس(Annual Accounts)کا جائزہ لیں تو ہمیں اس میں ایسے کاروبار بھی ملیں گے جن میں سرمایہ پر منافع (Return on Capital Employed)کی شرح 50٪ سالانہ ،بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو گی۔اس منافع کا ایک معمولی سا حصہ بطور سود ان غریب لوگوں کے حصے میں بھی آتا ہے جن کا سرمایہ دراصل اس کاروبار میں لگا ہوتا ہے۔ اس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھ لیجیے کہ بالفرض ایک سرمایہ دار کسی بینک سے ایک ارب روپے 10٪ سالانہ شرح سود پر لیتا ہے اور اس سرمائے سے پچاس کروڑ روپے سالانہ نفع کماتا ہے۔ اس میں سے وہ دس کروڑ بینک کو بطور سود ادا کرے گا اور بینک اس میں ٪ ۸ سالانہ کے حساب سے آٹھ کروڑ روپے اپنے کھاتہ داروں (Deposit Holders)کو ادا کرے گا۔ چونکہ یہ کھاتہ دار بہت بڑی تعداد میں ہوں گے جنھوں نے اپنی تھوڑی تھوڑی بچت بینک میں جمع کروائی ہو گی، اس لیے ان میں سے ہر ایک کے حصے میں چند ہزار یا چند سو روپے سے زیادہ نہیں آئے گا۔ اس طریقے سے سرمایہ دار ، عام لوگوں کو چند ہزار روپے پر ٹرخا کر ان کا پیسا استعمال کرتا ہے اور اسی پیسے سے خود کروڑوں روپے بنا لیتا ہے۔ اس مثال سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جس طرح جاگیر دارانہ نظام میں جاگیر دار یا مہاجن غریبوں کو سود پر رقم دے کر ان کا استحصال کیا کرتا تھا، اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار غریبوں سے سود پر رقم لے کر ان کا استحصال کرتا ہے۔اس کے علاوہ فیوڈل ازم کے مہاجنی سود کا سلسلہ بھی اس نظام میں پوری طرح جاری ہے جس میں کریڈٹ کارڈز کے ذریعے Micro-Financingکا سلسلہ جاری ہے۔ اس معاملے میں 6٪ 3سالانہ کے حساب سے سود بھی وصول کیا جارہا ہے۔ اس سود میں سے صرف 8-10٪ اپنے کھاتہ داروں کو ادا کیا جارہا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی ایک اور خصوصیت جوئے کا فروغ ہے۔ یہ لعنت فیوڈل ازم میں بھی اسی طرح پائی جاتی تھی۔ دنیا بھر میں جوا کھیلنے کے بڑے بڑے ادارے قائم کیے جاچکے ہیں۔ سٹاک ایکسچینج، فاریکس کمپنیز اور بڑی بڑی کیپیٹل اور منی مارکیٹس ان کیسینوز کے علاوہ ہیں جہاں بڑی بڑی رقوم کا سٹہ کھیلا جاتا ہے۔ کھربوں روپے سٹے میں برباد کر دیے جاتے ہیں، مگر بھوک سے مرنے والے بچوں کا کسی کو خیال نہیں آتا۔ ان

کیسینوز میں جوئے کے ساتھ ساتھ بے حیائی اور بدکاری کو بھی فروغ مل رہا ہے ،بلکہ دنیا بھر میں سیاحت کو فروغ دینے کے لیے جوئے اور بدکاری کے مراکز بھی قائم کیے جاچکے ہیں۔ سود اور جوا ایسی برائیاں ہیں جن کا تعلق الحاد کی اخلاقی بنیادوں سے قائم کیا سکتا ہے۔ اس کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

اخلاق اور معاشرت

الحاد کے اثرات سے جو چیز سب سے زیادہ متاثر ہوئی ہے، وہ اخلاق انسانی اور نظام معاشرت ہے۔ اگر کوئی یہ مان لے کہ اس دنیا کا کوئی خدا نہیں ہے، موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے جہاں اسے اپنے کیے کا حساب دینا ہوگا تو پھر سوائے حکومتی قوانین یا معاشرتی دباؤ کے کوئی چیز دنیا میں اسے کسی برائی کو اختیار کرنے سے نہیں روک سکتی۔ پھر اس کی زندگی کا مقصد اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ دولت اور اس سے لطف اندوز ہونا ہی رہ جاتا ہے۔ اگر اسے یقین ہو کہ کوئی اسے نہیں پکڑ سکتا تو پھر کیا حرج ہے کہ وہ اپنے کسی بوڑھے رشتے دار کی دولت کے حصول کے لیے اس کو زہر دے دے ؟ اگر وہ اتنا ہوشیار ہو کہ پولیس اس کا سراغ نہیں لگا سکتی ہو تو پھر لاکھوں روپے کے حصول کے لیے چند بم دھماکے کر کے دہشت گرد بننے میں کیا حرج ہے؟ قانون سے چھپ کر کسی کی عصمت دری سے اگر اس کی درندگی کی تسکین ہوتی ہے تو پھر اس میں کیا رکاوٹ ہے؟ اپنی خواہش کی تسکین کے لیے سو بچوں کو اغوا کرکے، ان سے زیادتی کرکے ،انھیں قتل کرکے تیزاب میں گلا سڑا دینے میں آخر کیا قباحت ہے؟ اپنے یتیم بھتیجے کامال ہڑپ کر جانے سے آخر کیا فرق پڑتا ہے؟ جھوٹا کلیم داخل کرکے اگر اسے اچھی خاصی جائداد مل سکتی ہے تو وہ ایسا کیوں نہ کرے؟ کسی کو اپنی گاڑی کے نیچے کچلنے کے بعد اسے ہسپتال تک پہنچا کر اپنا وقت برباد کرنے کی آخر کیا ضرورت ہے؟ جائداد کو تقس